پروفیسر منظور احسن عباسی

قرض وربا

قرض وربا کی اسلامی حیثیت خود ان ہی دونوں الفاظ کی ان تعبیرات سے واضح ہو جاتی ہے جو خدا اور رسولؐ یا قرآن وحدیث میں معتبر ہے۔

قرض

قرض کے لغوی معنے کاٹنے یا علاحدہ کر دینے کے ہیں اور اصطلاح معاملات میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص اپنے مال کا کچھ حصہ اپنے سے علاحدہ کر کے کسی دوسرے کو بغرض انتفاع تھوڑے عرصہ کے لیے دیدے۔ قرض کی یہ حیثیت صدقہ سے اس قدر مشابہ ہے کہ احادیث میں اس کو صدقہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

کل قرض صدقة — یعنی تمام قرضے صدقہ ہیں

ایک اور حدیث میں ہے

قرض الشئی خیر من صدقته۔ — یعنی کسی چیز کو قرض دینا اس کو صدقہ کر دینے سے بہتر ہے۔

قرض کو صدقہ یا صدقہ سے بہتر فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ صدقہ کی طرح اس میں بھی کسی قسم کی ذاتی منفعت کا ترقب اس کو قرض کی اسلامی خصوصیت سے خارج کر دے گا۔ اس خیال کی مزید تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

کل قرض جر منفعة فهو الرباء — یعنی جس قرض میں جر منفعت ہو وہ سود ہے (قرض نہیں ہے)

احادیث رسول اللہ کی یہ تصریحات منشاء کلام الٰہی کے عین مطابق ہیں کیونکہ قرآن حکیم میں قرض کی ترغیب وتحسین کم از کم نصف درجن مقامات میں آئی ہے۔ اور ہر جگہ اس کا نام قرض حسنہ ہے۔

واقرضوا اللہ قرضا حسنا + من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا + ان تقرضوا اللہ قرضا حسنا +

وغیرہ۔ غالباً قرآن حکیم میں کسی ایک جگہ بھی قرض کا لفظ بغیر قید صفت حسن نہیں آیا جس سے عیاں ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک قرض کی ایک ہی صورت ہے جس کا نام "قرض حسنہ" ہے اور قرض حسنہ اسی کو کہتے ہیں کہ اس سے کسی کی ذاتی منفعت مقصود نہ ہو۔ یہ مراد بیانِ قرآنی کے اس نہج بلاغت سے بالبداہت ٹپکی پڑتی ہے کہ اللہ تعالےٰ

نے اقراض کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے جس کا مدعا سوا اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو قرض دے تو یہ نہ سمجھے کہ میں نے فلاں کو قرض دیا ہے بلکہ یہ سمجھے کہ میں نے اللہ کو دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب قرض دینے والا یہ تصور کرے کہ میں نے کسی شخص کو قرض دیا ہی نہیں تو اس شخص سے کسی منفعت کی امید کیوں رکھے گا گویا قرض دینے کے بعد مقروض سے ہر منفعت عدلاً اور اخلاقاً ممنوع ہوا۔ البتہ جس کی طرف اقراض کیا گیا ہے اس سے امید رکھنا درست ہوگا۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے ہر اس مقام پر جہاں قرض دینے کی ترغیب فرمائی ہے ساتھ کے ساتھ وعدۂ جزائے قرض بھی فرمایا ہے۔ مثلاً:

من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضعفہ لہ — کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے کہ اللہ اس کو دُگنا کر دے

ایک اور جگہ ہے

وما اٰتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما اٰتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون۔ — یعنی یہ سود جو دیتے ہو کہ لوگوں کا مال بڑھتا رہے تو (ہر چند کہ تم اسے زیادتی سمجھتے ہو) اللہ کے نزدیک وہ بڑھتا نہیں ہے۔ البتہ وہ جو تم پاک دل سے محض اللہ کے واسطے کچھ دیتے ہو تو ایسے دینے والوں کے ہی دُگنے ہوں گے۔

پاک دل سے اللہ کی خوشنودی کے لیے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ زکوٰۃ بھی ہے اور قرضہ بھی اور دونوں صورتوں میں اللہ کے سوا کسی اور سے کسی منفعت کا ترقب بلاشبہ قرض کے اسلامی تصور سے باہر کی چیز ہے۔

قرض اور صدقہ کی عملی حیثیت سے تقابل بھی دونوں صورتوں کو نفع اندوزی کے عنصر سے بے لوث ثابت کرتا ہے۔ صدقہ مال کی دائمی تملیک کا نام ہے اور قرض مال کی عارضی تملیک کو کہتے ہیں۔ صدقہ کی صورت میں فریق ثانی کو مال پر دائمی تصرف اور اس سے متمتع ہونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن قرضے کی صورت میں مال پر عارضی تصرف اور اس سے متمتع ہونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اب وہ مال جو صدقہ میں دیا گیا اُس میں سے کچھ طلب کرنا یا صدقہ دینے کی بنا پر کسی قسم کی منفعت کا طالب ہونا جس طرح اس صدقہ کو باطل کر دیتا ہے۔ اُسی طرح وہ مال جو قرض میں دیا گیا اُس کے منافع میں سے کچھ طلب کرنا یا مقروض سے کسی قسم کی منفعت کا طالب ہونا بھی قرض سے اسلامی روح کو نکال دیتا ہے۔ آیت میں جو آیا ہے کہ:

لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذیٰ۔ — یعنی احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر اپنے صدقات کو ضائع مت کرو۔

لفظ صدقات میں قرضہ بھی شامل ہے کیونکہ حدیث میں قرض کو بھی صدقہ ہی کہا گیا ہے۔ مزید برآں صدقہ یا قرض دے کر منفعت طلبی بجائے خود انتہائی سفلگی اور بے حد گھناؤنی حرکت ہے۔ جس سے ملت بیضا کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔

ربوا

اب لفظ ربا کی تحقیق سنیئے

لغت میں اس لفظ کے معنی زیادتی یا بڑھوتری کے ہیں۔ اور اصطلاحِ معاملات میں اس بڑھوتری کو کہتے ہیں جو فریقین میں سے کسی ایک کو حاصل ہو جائے مختصراً اس کو معاملہ بالفضل کہہ سکتے ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ بیع کے مقابل میں آیا ہے۔ بیع کے معنی خرید و فروخت کے ہیں۔ بظاہر خرید و فروخت کے معاملہ کو زیادتی اور بڑھوتری کے مفہوم سے کوئی تقابل نہیں لیکن دونوں کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان دونوں الفاظ میں نہ صرف یہ کہ تقابل ہے بلکہ تضاد ہے کیونکہ بیع ایک ایسا معاملہ ہے جس میں فریقین معاملہ کو یکساں منفعت حاصل ہوتی ہے اور ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں کچھ زیادہ نہیں ملتا اور یہ حلال ہے۔ اس کے برعکس ربا ایک ایسا معاملہ ہے جس میں دونوں فریق کی منفعت مساوی نہیں ہوتی بلکہ نفع کے اعتبار سے ایک کو دوسرے سے کچھ زیادہ ملتا ہے۔ یہی ربا ہے۔ اور یہ حرام ہے

احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ یعنی اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے

بیع و ربا کے اس تقابل کا مقصد یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اسلامی نظام میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں یعنی جہاں تجارت ہو گی وہاں سُود نہ ہو گا اور جہاں سُود ہو گا تجارت نہ ہو گی۔ لہذا "تجارتی سُود" جیسی کوئی اصطلاح اسلامی تمدن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اسلامی معاشرت میں یہ لفظ ایسا ہی بے مصرف ہے جیسے علم طبیعات میں "ٹھنڈی آگ"۔ چنانچہ قانونِ الٰہی کی رو سے ربوی معاملات کو نافذ الاثر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسلامی ضابطۂ معاشیات کی یہ ایک ایسی اساسی دفعہ ہے جس کی نظیر یوم ازل سے ابد تک کسی ملت کے عملی ضابطوں میں نہیں مل سکے گی۔ قرآن حکیم نے بیع کی بنیاد عدل پر قرار دی ہے اور ربا کی بنا تعدی پر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر 'بیع' کے 'عدل' پر اور 'ربا' کے 'تعدی' پر مبنی ہونے کا کیا ثبوت ہے جبکہ معاملہ بیع اور معاملہ ربا دونوں کی بنیاد تبادلۂ اشیا پر ہے اور یہ ضروری نہیں کہ اشیائے تبادلہ ہمیشہ ایک دوسرے کے برابر ہوں۔ لیکن اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ اگر دو ہم جنس اشیاء کی مقدار میں تفاوت نہ ہو تو ان کا تبادلہ عدل پر مبنی ہو گا۔ اور اسی کو بیع کہیں گے۔ لیکن اگر ایک طرف وزن زیادہ ہو یا کوئی اور چیز بڑھا دی گئی ہو تو ایسی صورت میں تبادلہ عدل پر مبنی نہ ہو گا۔ اور اس کو ربا کہیں گے۔ لیکن اس صورت میں جب کہ اشیاء متبادل مختلف الجنس ہوں تو اُن کے تبادل میں 'ربا' کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ روا ہو گا کہ ایک تولہ سونے سے آپ دس من گندم خرید لیں یہ عدل ہو گا۔ لیکن ایک تولہ سونے کے عوض ایک ہی تولہ سونا لینا ہو گا۔ ایک رتی بھی زیادہ پر سودا ہوا تو یہ ربا ہو گا اور ربا کی یہ ادنیٰ سی شمولیت بھی اس معاملہ کو 'بیع' کے زمرہ سے نکال کر 'ربوا' میں داخل کر دے گی۔ یہ بیع

محض ایک رتی کی حد تک نہیں بلکہ کلیتہً باطل ہو جائے گی۔ کیونکہ منشائے کلام الٰہی کے مطابق ربا کے ہوتے ہوئے بیع کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر سیر بھر اچھی قسم کی گندم کا تبادلہ سوا سیر گھٹیا قسم کی گندم سے کیا جائے تو اس کو بھی کیوں نہ برابر سمجھا جائے۔ کیونکہ گھٹیا گندم کی مقدار کی زیادتی بڑھیا گندم کے مقدار کی کمی کی تلافی کر سکتی ہے۔ بظاہر یہ ایک معقول بات ہے۔ بلاشبہ ایک شے کی کمیت کو دوسری ہم جنس شے کی کیفیت کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن عیب کو مقدار کے پیمانے سے ناپنا ضروری ہو گا جس کے لیے ایک نہایت سادہ اور حقیقت پسندانہ طریقہ بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے۔ اور ایسی صورتوں میں اس میزانِ عدل سے کام لینے کی رہنمائی فرمائی ہے جس کو علومِ عمرانیات کی اصطلاح میں عادلِ اوسط کہا جاتا ہے۔ یعنی رائج الوقت سکہ یا کوئی اور ثمنی شے۔ اس کی عملی شکل اس حدیث میں ملاحظہ کیجیے، جس میں حضرت بلال رضؓ نے بتایا ہے کہ میرے پاس چھوٹی قسم کی کھجوریں تھیں انہیں بازار لے گیا اور دو صاع کے عوض ایک صاع اچھی کھجور کے حساب سے بیچ دی۔ آنحضرتؐ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا:

ادبیت اردوا البیع ثم لیع تمرنا بذھب او فضۃٍ او حنطۃً ثم اشتربہ تمراً۔	یہ تو ربا ہو گیا اس بیع کو لوٹا دو اور کھجور کو پہلے سونے چاندی یا گیہوں کے عوض بیچ دو پھر اس کی قیمت سے (اچھی) کھجور خرید لینا۔

ایک نوع کی مختلف الصفات اشیاء میں نسبتِ مساوات قائم کرنے کا یہی سب سے بہتر اور قابلِ عمل طریقہ ہے باقی رہیں مختلف النوع اشیاء سو ان کے تبادلہ میں چونکہ ربا کا اندیشہ ہی نہ تھا اس لیے حضورؐ کا ارشاد ہے:

اذا اختلف النوعان تبیعو فلا باس بہ واحداً بعشرۃ۔	یعنی اشیاء متبادلہ مختلف الانواع ہوں تو ان کے سودے میں ربا کی گنجائش ہی نہیں، ایک کو دس میں بیچ سکتے ہو۔

اس مقام پر حلتِ بیع اور حرمتِ ربا کی حکمت کے باب میں ایک بار پھر یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ بیع کی بنیاد اساوی انتفاع باہمی پر ہے اور ربا کہتے ہیں اس نفع کو جو صرف ایک ہی فریق کو حاصل ہو۔ اور یہ صرف ہم جنس اشیاء کے معاملہ میں ہو سکتا ہے۔ خواہ نقد اور دست بدست سودوں میں ہو یا ادھار اور میعادی سودوں میں۔ قرض بھی اپنی مادی شکل میں ایک معاملہ بیع ہے جس میں اشیاء متحد النوع کا تبادلہ ہوتا ہے۔ از روئے قرآن اس میں لازم ہے کہ اشیاء متبادل کی مقدار برابر ہو۔ لہٰذا قارض کو صرف اتنا ہی لینے کا حق ہے جتنا اس نے قرض میں دیا تھا۔ اس پر کسی قسم کی بڑھوتری عدل کے خلاف اور مقروض پر ظلم ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے عہدِ نبوی کے تمام قرض خواہوں

کو حکم دیا کہ:

وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ، ان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تُظلمون۔

اگر تم مسلمان ہو تو سود کی تمام بقیہ رقم سے دستکش ہو جاؤ۔ اگر ایسا نہ کیا تو خدا اور رسول سے لڑنے کے لیے تیار رہو۔ ہاں اگر تم نے توبہ کر لی تو راس المال کے حقدار ہو گے نہ تم ظلم کرو (کہ جتنا دیا ہے اُس سے زیادہ لو) اور نہ تم پر ظلم ہو (کہ جو کچھ دیا ہے اس سے کم پاؤ)

قرض اور ربا کی ان قرآنی تصریحات کے پیش نظر احادیث میں متحد النوع اشیاء کی فہرست اتحاد النوع کے اصول، سودی معاملات کی چھان پھٹک اور سود سے بچنے کی تاکید اور سود خواری پر تہدید و تخویف و ترہیب نہایت وضاحت سے موجود ہے۔ اور اسلامی فقہ میں اس موضوع پر مستقل ابواب مرتب کیے گیے ہیں۔ جن کی تفصیل اس مقام پر ممکن نہیں۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ خدا و رسولؐ کے فرمودات میں ایسی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ اسلامی تصورات کو سودی طریق کار سے کسی صورت بھی وابستہ کیا جائے۔

حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ سود کے باب میں اسلامی نظریات اور قرآن و حدیث کی تصریحات اس قدر واضح ہیں کہ اس مسئلہ کو بحث کا موضوع بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ اسلامیات کا ہر طالب علم بلا تکلف اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہی کہے گا کہ "سود" حرام ہے۔ حکومت کا ہو۔ بنک کا ہو یا کسی فرد واحد کا۔ لیکن بین الملی اقتصادی روابط کو برپا اور مستحکم رکھنے اور ملک کی ہر گونہ سیاسی، صنعتی، تمدنی اور معاشرتی ترقیات کی دوڑ میں اقوام عالم کے دوش بدوش چلنے اور ملکی سالمیت کی بقا و تحفظ کے لیے سودی نظام کار کی اہمیت سے صرف نظر ممکن نہیں۔ بلا شبہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل ملکی انقلاب کا دوسرا نام ہوگا۔ اور وہ ذہن و فراست اعجاز کی حامل ہوگی جو اس کا حل تلاش کر سکے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ فراست نے موجودہ دنیا کو حالیہ سودی نظام کار کے نفوذ اور اس کی ہمہ گیری سے ہزار سال پہلے ہی آگاہ فرما دیا تھا:

لیاتین علی الناس زمان لا یبقی منھم احدٌ الا اٰکل الربوا فان لم یاکلہٗ اصابہ من غبارہ۔

یعنی بلا شبہ ایک زمانہ ایسا ضرور آئے گا کہ کوئی شخص بھی سود کھانے سے نہ بچے گا۔ کوئی بچ بھی گیا تو اس کا غبار اس تک ضرور پہنچے گا۔

اس حدیث کے پیش نظر اسلامی ممالک کے اقتصادی شعبوں میں سودی نظام کا انتشار محل تعجب نہیں۔ البتہ یہ امر مستوجب حیرت ضرور ہے کہ بعض لوگ نہایت دیدہ دلیری سے اس قطعاً غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظریات کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش میں ہیں۔ مسلم اقوام کا سود میں منلطخ ہو جانا میرے نزدیک اس قدر افسوس ناک نہیں ہے جتنا اس نئی ذہنیت کی نشو و نما خوفناک ہے۔ میرے لیے اگر ممکن ہوتا تو میں موجودہ بنکاری کے طریق کار کے حق میں فتوے دیتے ہوئے بھی اسلام کے اس طے شدہ نظریہ پر بحث کی اجازت نہ دیتا۔

اب ایک پچھلتی نظر ان دلائل پر بھی ڈال لیجئے جو بینک کے سود کو ربائے ممنوع سے ممیز کرنے کے لیے بالعموم پیش کی جاتی ہے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ بنک کے کاروبار کو بیع سلم سے مطابقت ہے اور چونکہ اسلام بیع سلم کی اجازت دیتا ہے اس لیے بنک کا سود بھی ممنوع نہیں ہے۔ لیکن یہ دلیل بیع سلم کے طریق عمل کے بارے میں ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیع سلم کا معاملہ طے پانے کے وقت جو روپیہ کسی شخص کو اس شرط پر دیا جاتا ہے کہ مثلاً ایک ماہ کے بعد فلاں مال طے شدہ نرخ پر ملے گا۔ وہ روپیہ قرض ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔ یہ روپیہ قرض نہیں ہوتا بلکہ پیشگی قیمت کی ادائیگی ہے۔ پیشگی قیمت ادا کر دینے اور قرض دینے کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ قیمت واجب الادا ہوتی ہے۔ قرض دینا کبھی واجب نہیں ہوتا۔ قرض میں جو رقم دی جاتی ہے دائن اسی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ سلم میں جو چیز قیمت کے طور پر دی جاتی ہے اس کے عوض کسی اور چیز کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ادائگی قرض کسی وقت بھی ہو سکتی ہے اس میں تعجیل واجب ہے سلم میں ایک ماہ کی تاخیر واجب ہے۔ قرض محض رخصت انتفاع مال ہوتا ہے جس سے قارض کو کسی منفعت یا کام روائی سے غرض نہیں ہوتی لیکن سلم معاملہ بیع ہے جس میں طرفین کو ذاتی منفعت پیش نظر ہوتی ہے۔ بنک کو روپیہ دے کر ہم اسی قدر رقم واپس لیتے ہیں اور سود کا مطالبہ مزید براں ہوتا ہے اور بیع سلم میں ہم روپیہ دے کر نہ اس کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ اس مقدار مال سے زیادہ کے طالب ہوتے ہیں جس کا تعین پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے۔ غرض 'بیع سلم' کو 'تجارتی سود' کی بے معنی اصطلاح سے ہم آہنگ کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ اسلام میں 'تجارتی سود' نام کی کوئی چیز نہیں اور نہ خود موجودہ ربوی نظام میں COMMERCIAL INTEREST کوئی معنی خیز اصطلاح ہے۔ عام طور پر تجارتی سود سے وہ سود مراد ہوتا ہے جو تجارتی اغراض کے قرضوں پر لگایا جاتا ہے۔ اگر یہ TERMINOLOGY صحیح مان لی جائے تو قرض کی مختلف اغراض کی بنا پر تجارتی سود کی طرح زراعتی سود، احتیاجی سود، ازدواجی سود۔

جامہ بافی یا پاپوش سازی سود جیسی مضحکہ خیز بے شمار اصطلاحیں معرض وجود میں لائی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ سب بے مصرف ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ "تجارتی سود" کا لفظ بنکاری لغات میں بھی نظر سے نہیں گزرا۔

بنک کا سود جائز ہونے کی ایک دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ سود ممنوع وہ ہونا چاہیئے جو قرض دینے والا مقرر کرے۔ لیکن وہ سود جو قرض لینے والا کوئی ادارہ یا کوئی شخص مقرر کرے وہ ممنوع نہ ہونا چاہیئے۔ یہ کوئی دلیل نہیں بلکہ حرکت مذبوحی ہے کیونکہ ایسی دلیل پیش کرنے والے یہ نہیں بتا سکے کہ ان دونوں صورتوں میں امتیاز کی وجہ کیا ہے؟ آں حضرت[ؐ] کا فیصلہ تو یہ ہے کہ شرح سود کی تجویز خواہ کسی طرف سے ہو بہر حال "ربا" ہے۔ بلکہ سود دینے والا جس کو تعین سود میں کوئی دخل ہی نہیں وہ بھی مستوجب بازپرس ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں وہ طویل گفتگو جو بنک کی تعیین شرح سود کے اسباب کے باب میں کی جاتی ہے کہ یہ شرح قرض خواہ کی احتیاج کے پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ بازار کے کاروباری حالات کے پیش نظر ہوتی ہے محض بے مصرف ہے۔

کچھ حضرات بنک کاری کے طریق کار کو اسلامی طریق مضاربت کے مماثل تصور کر کے جواز سود پر استدلال کرتے ہیں۔ اس خیال کی بنا بھی وہی غلط فہمی ہے جو بیع سلم کے بارے میں ہوئی کہ وہ رقم جو کسی شخص کو کاروبار کے لیے اس شرط پر دیتا ہے کہ اس کے منافع میں کسی خاص نسبت سے شریک رہے گا وہ قرض ہے حالانکہ وہ قرض نہیں ہوتی کیونکہ مضاربت کا معاملہ سرمایہ اور محنت کی باہمی شراکت پر مبنی ہے جس میں فریقین نفع و نقصان کے شریک ہوتے ہیں۔ نفع ہو تو ایک اپنے مال کی وجہ سے اور دوسرا اپنی محنت کے باعث شریک نفع ہوتا ہے اور نقصان ہو تو ایک کا سرمایہ اور دوسرے کی محنت کا اتلاف ہوتا ہے۔ اور یہ ساری باتیں قرض میں نہیں ہوتیں۔

سودی قرضوں کے ممنوع ہونے کے اسباب میں بلاشبہ اس اخلاقی سبب کو بھی دخل ہے کہ قرض دینے والا من حیث المعاملہ مقروض کے نفع یا نقصان سے کوئی غرض نہیں رکھتا جس سے خود غرضی کے جذبات کو تقویت پہنچتی ہے اور تمدن و معاشرت کے صالح تقاضوں کو دھکا لگتا ہے۔ لیکن صرف اسی ایک اخلاقی سبب کو حرمت ربا کی بنیاد قرار دے کر جواز ربا کے لیے یہ پہلو تلاش کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر قارض و مقروض فائدے یا نقصان یا دونوں میں کسی طرح شریک ہو جائیں تو سود روا ہو جائے گا۔

یہ تمام دلائل صرف اس صورت میں ابھرتے ہیں جبکہ بیع، قرض اور ربا کی قرآنی تصریحات سے صرف نظر کر لیا جائے۔

غرض جوازِ سود کے لیے کوئی راہ نکلتی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر موجودہ دور کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھ بند

کر لینا بھی ممکن نہیں۔ ہر چند کہ میری محدود نظر ملک کے اس سب سے بڑے سیاسی اور اقتصادی مسئلہ کی وسعتوں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن اسلام کی ناقابلِ تردید الوہیت کے پیشِ نظر میرا ایمان ہے کہ ان مسائل کا حل بھی اس میں موجود ہے اور سودی نظام کے ارتقا میں جن مشکلات کا تصور ہے ان سب پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اور جب ہم اشتراکی ممالک کے نہایت عظیم الشان ترقی پسند نظام مملکت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا ایمان اس باب میں اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے کہ ترقیات کے سیلاب میں نظامِ سود کو ایک پرکاہ کی حیثیت بھی حاصل نہیں ہے۔ صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ قوم کو اسلامی روایات پر قائم رکھتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا راستہ بتانے کے لیے کسی روشن دماغ اور خداداد فراست رکھنے والے رہنما کی تلاش کی جائے۔ بظاہر مجھے اس سوال کا جواب کسی طرف سے نہیں مل سکا کہ پاکستان کے تمام بنکوں کو 'مضاربتی' نظام کے اصول پر منظم کرنے میں آخر کونسا امر مانع ہے۔ یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ ملک کے تمام بنکاری ادارے تجارتی اداروں کے قالب میں ڈھال دیے جائیں اور بنک کی شرح سود کو سرمایہ کی بنیادوں پر نہیں بلکہ منافع کی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ شاید یہ بھی ممکن ہو کہ منافع کی بنیادوں پر بہ شرح سود مقرر کیا جائے اس کے مطابق حاصل شدہ منافع میں سے ایک مقررہ رقم سرمایہ کاروں کو ماہ بماہ یا جس طرح مناسب ہو تقسیم ہوتی رہے۔ اور جب کسی بنک کا مالی سال ختم ہو تو ادا شدہ منافع کی رقم وضع کر کے تفاوت کی بقیہ رقم مالکانِ سرمایہ کو یک مشت ادا کر دی جایا کرے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نظام کار کو فروغ دینا اتنا دشوار نہ ہو گا جتنا روسی عوام کو اشتراکی نظام کا برپا کرنا تھا۔

عہدِ رسالت میں قرض کے لین دین کی شکل

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرض لینے دینے کی شکل وہی تھی جو اب ہے۔ یعنی سودی اور بغیر سود کے دونوں طرح کے قرضے جاری تھے۔ اسلام نے پہلی صورت کو گناہ اور مستوجب عذاب اور دوسری صورت کو ثواب اور موجب اجر قرار دیا۔ اس کے بعد اسلامی معاشرے سے سود ہمیشہ کے لیے موقوف ہو گیا۔

اسلامی قرض

اسلام میں قرض مالی عبادت کی ایک قسم ہے اور اس کو ایک نیکی کا کام تصور فرمایا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ۶ جگہ قرض کی ترغیب آئی ہے اور ہر جگہ اس کو صفت "حسن" کے ساتھ مذکور فرمایا ہے۔ گویا اسلام میں قرض حسنہ کے سوا کسی اور قرض کا تصور ہی نہیں ہے۔

قرض دینے کی غرض

اسلام میں قرض کی غرض محض مستقرض کی اعانت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے صدقہ کی غرض محتاجوں کی اعانت ہے۔ حدیث میں ہے القرض صدقۃ یعنی قرض ایک صدقہ ہے۔ قرضہ اور صدقہ دونوں کی بنیاد "یک طرفہ انتقال ملکیت" ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے کو اپنے مال کا مالک بنا دیتا ہے۔ یہ تملیک اگر دائمی ہو تو "صدقہ" ہے اور "وقتی" ہو تو قرض ہے۔ دونوں میں سے کسی میں بھی طلب منفعت کا تصور قرآن حکیم کے خلاف ہے اور یوں بھی دنائت و سفلگی ہے۔ حدیث میں ہے:

کل قرض جر منفعۃ فھو ربوا — یعنی ہر قرض جس کی غرض طلب منفعت ہو سود ہے۔

قرآن حکیم نے اس مقصد کو ایک اصولی شکل دے دی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں قرض کی ترغیب ہے ہر جگہ اللہ کو قرض دینے کا حکم ہے۔ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قرض جو تم کسی کو دیتے ہو وہ در اصل اللہ کو دینا ہے۔ لہذا مقروض سے کسی منفعت کا طالب ہونا اصولاً صحیح نہیں رہا۔ کیونکہ یہ قرض (یا عارضی تملیک مال) اللہ کی طرف منسوب ہے اور اس کا عوض بھی وہی دے گا۔

من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضعفہ لہ اضعافاً کثیرا (بقرہ ۲۴۶) — کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کا صلہ چند در چند عطا فرمائے۔

غرض قرض سے قرض لینے والے کو خواہ کتنی ہی منفعت حاصل ہو قرض کا معاوضہ طلب کرنا اسلامی نظریات کے منافی ہے۔

قرض اور صدقہ کا فرق

قرآن حکیم میں قرض کا ذکر بالعموم صدقات کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ صدقات کے مصارف یا اہل استحقاق کی تعیین کر دی گئی ہے۔ لیکن قرض ہر شخص لے سکتا ہے۔ صدقہ مالدار کو لینا ممنوع ہے اور بنی فاطمہ اور آل عباس پر حرام ہے۔ لیکن قرض لینا کسی کے لیے بھی شرعاً ممنوع اور حرام نہیں ہے۔ عہد نبوی میں بھی قرض صرف غریبوں اور محتاجوں کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ صاحب استطاعت اور ارباب دول بھی قرض لیتے تھے۔ بعض اصحاب کا یہ فرمانا کہ عہد نبوی میں صرف حاجتمندانہ اور صرفی قرضے تھے محض ایک خیالی بات ہے۔ اس خیال کی تردید علی بن طلحہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ضحاک سے روایت کی ہے:

قال کان ربا یتبایعون بہ فی الجاھلیۃ — یعنی وہ کہتے ہیں کہ عہد جاہلیت میں لوگ ربوی تجارت کیا

فلما اسلموا امروا ان یاخذوا رؤس اموالھم (تفسیر ابن کثیر تحت آیہ ذروا ما بقی) کرتے تھے پھر جب مسلمان ہو گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ صرف راس المال لے لیں۔

اس روایت میں "بیع بالربا" کا جو ذکر ہے اس کے معنی سوا اس کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ تجارت سودی روپیہ سے کی جاتی تھی۔ مع ہذا اس خیال پر یقین کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ عہد نبوی میں صنعت و حرفت تجارت و زراعت، شادی بیاہ، جنگ و قتال اور ہر گونہ ضروریات موجود تھیں لیکن قرض صرف نجی اور صرفی ضروریات ہی کے لیے لیا جاتا تھا اور کسی دوسرے مقصد کے لیے نہیں لیا جاتا تھا اور یا یہ کہ ہر گونہ مقاصد کے لیے قرض لیا جاتا تھا۔ صرف تجارت ہی ایک ایسا مقصد تھا جس کے لیے کوئی قرض نہ لیتا تھا۔

قرض لینے کی اغراض

عہد نبوی میں لوگ قرض کن اغراض کے لیے لیتے تھے۔ ان اغراض کا استقصا نہ تب ممکن تھا اور نہ اب ممکن ہے۔ اغراض استقراض کی تعیین خود مستقرض کا کام ہے اور اس کی ضروریات کی اقسام لامحدود ہیں۔ میرے ایک محترم دوست عہد نبوی میں تجارتی قرض کی مثال تلاش کرنے کی سالہا سال سے کوشش فرما رہے ہیں لیکن انہیں اب تک کوئی مثال نہیں ملی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان کو تمام دوسری اقسام کے قرضوں کی مثالیں مل گئی ہیں؟ مثلاً ازدواجی قرض، صنعتی قرض، تعمیراتی قرض، تعلیمی قرض وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ عہد نبوی میں کسی ایسے قرض کی نظیر بھی نہیں مل سکتی جس میں نجی ضرورت کی تصریح بھی موجود ہو۔

زمانہ جاہلیت میں قرض کی صورتیں

جناب مولانا مودودی صاحب نے (بحوالہ تفاسیر ابن جریر و کبیر و احکام القرآن) اپنی کتاب "سود" میں قرض کی چار صورتوں کا ذکر فرمایا ہے جو زمانہ جاہلیت میں جاری تھیں:

ایک صورت تو وہی ہے جس پر سود خوار تاجر (غیر اسلامی ممالک میں بالخصوص) اب بھی عمل کرتے ہیں۔ یعنی ایک شخص کے ہاتھ کوئی چیز قرض فروخت کرنا اور ادائے قیمت کے لیے ایک وقت مقررہ تک مہلت دینا اور انقضائے مدت کے بعد قیمت میں اضافہ کر دینا۔ اس کی نظیر ہمارے ہاں بجلی کے بلوں اور بعض دکانداروں کے مطالبات میں بھی معائنہ کی جا سکتی ہے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور پھر یہ کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں دگنا یا اتنا زیادہ دوں گا (یہ صورت بہت عام تھی) نیز واضح رہے کہ اس صورت میں سود کا تعین قرض لینے والا کرتا ہے دینے والا نہیں۔

تیسری صورت یہ تھی کہ فریقین پہلے سے طے کر لیتے کہ اتنی مدت کے لیے قرض دیا جائے گا اور اتنی رقم راس المال سے زیادہ ادا کی جائے گی (حکومت کے میعادی قرضوں کی بالعموم یہی شکل ہے)۔

چوتھی صورت بالکل وہی ہے جو آج کل سود خوار طبقہ میں عام ہے کہ ایک شخص مدت معینہ کے لیے قرض دے اور یہ طے کرے کہ ماہ بماہ سود کی ایک مقررہ رقم وصول کرتا رہے گا۔

ان تمام صورتوں میں اس امر کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے کہ قرض لینے دینے والے کس غرض کے لیے یہ معاملہ کرتے تھے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ "حرمت سود" کے باب میں اغراض قرض کو کوئی دخل نہیں ہے۔

مولانائے ممدوح نے اس تفصیل کو "جاہلیت کا ربا" کے ضمنی عنوان کے تحت درج فرمایا ہے۔ میں اس عنوان کو صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ شاید "ربا" کی دو قسمیں ہیں ایک جاہلیت کا "ربا" اور دوسرا کوئی اور "ربا" حالانکہ "ربا" کی حقیقت اس دور میں بھی وہی تھی جو اس دور میں ہے (تفصیل معنے "ربوا" کے تحت ملاحظہ ہو) اور حدیث میں جو "ربائے جاہلیت" کا ذکر آیا ہے اس سے "ربا" کی کوئی قسم مراد نہیں بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ وہ "ربا" جو اسلامی احکام سے پہلے واجب الوصول تھا۔

اجتماعی قرضے

تفسیر طبری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں اجتماعی ربوی قرضوں کا بھی رواج تھا۔ موسیٰ بن ہارون بروایت حضرت سدی بیان فرماتے ہیں کہ:

"عباس بن عبد المطلب اور بنی مغیرہ کا ایک شخص دونوں عہد جاہلیت میں سود کی آمدنی میں باہم شریک کار تھے۔ انہوں نے ثقیف کے بہت سے لوگوں کو قرض دے رکھا تھا۔ ظہور اسلام کے وقت سود کی بہت بھاری رقم ان لوگوں سے قابل وصول تھی۔ اس آیت (ذروا ما بقی من الربا) میں یہ حکم نازل ہوا کہ سود کی زائد رقم جو جاہلیت میں واجب الوصول تھی سب چھوڑ دو۔ (طبری تحت آیت بالا)

اب کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں اصحاب اجتماعی طور پر جو رقم سودی قرضہ پر دیتے تھے وہ اصولاً موجودہ نظام بنک کاری کے تحت دیئے جانے والے اجتماعی قرضوں سے مختلف تھی۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ بنکاری کا یہ وسیع الذیل ادارہ اور سود کی آمدنی سے بنی ہوئی یہ عظیم الشان عمارتیں اس وقت موجود نہ تھیں لیکن یہ فرض کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ قرض کو ذریعہ آمدنی بنانے والے یہ اصحاب ایام جاہلیت میں چن چن کر صرف ان ہی لوگوں کو قرض دیتے تھے جن کو نجی ضروریات لاحق تھیں یا نہایت محتاج تھے۔

تجارتی قرض

جوازِ ربا کے مباحث میں "تجارتی قرض" کا ذکر بار بار آتا ہے لیکن عقلاً و دیانۃً "تجارتی قرض" ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ عام طور پر اس سے مراد وہ قرضہ ہے جو کوئی شخص کاروبار میں لگانے اور نفع کمانے کے لیے لیتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کا تعین خود مستقرض کا کام ہے۔ قرض دینے والے کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اگر قرض دینے والا اس قسم کی کوئی شرط لگا کر قرض دیتا ہے تو عقلاً اور شرعاً اس کی یہ شرط باطل اور بے معنی ہے۔ صاحب درالمختار نے بحوالہ خلاصہ یہ اصول بتایا ہے کہ:

القرض بالشرط حرام وکل شرط لغو — یعنی کسی شرط پر قرض دینا حرام ہے اور اگر شرط کی بھی جائے تو وہ فضول (غیر مؤثر) ہے۔ (کتاب البیوع فصل قرض)

یہ ایک نہایت اہم اصول ہے اور اقراض کی اس اسلامی روح کے عین مطابق ہے جو حدیث "جر منفعت" میں جاری و ساری ہے۔ کیونکہ جب کبھی کوئی قرض دینے والا کسی شرط پر قرض دیتا ہے تو یقیناً کوئی منفعت اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے اور قرض سے روح ایثار و صدق سلب ہو جاتی ہے۔ انسانی شرافت اور مدنیت صالحہ کا یہ وہ معیار ہے جس کی نظیر (دوسری) اقوام عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

قرض کا قانونی مزاج

حقیقت یہ ہے کہ قرض کا قانونی مزاج کسی شرط کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ حکومت کے ترقیاتی منصوبوں اور تجارتی بنکوں میں بھی جو روپیہ مخصوص ترقیاتی منصوبہ کی تکمیل یا کاروبار تجارت کے لیے قرض کے طور پر لیا جاتا ہے کوئی حکومت یا کوئی بنک یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرض سے حاصل کیا ہوا روپیہ فی الواقع ان ہی اغراض میں استعمال کیا گیا ہے جن کے لیے لیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں کسی قرضہ کو تجارتی قرض کہہ دینا محض ایک فرضی تصور ہے والا واقعاتی یا قانونی حیثیت سے بے معنی لفظ ہے۔

نفع اور قرضے

جوازِ سود کے نظریہ کو عقلی دلیل سے خاصی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ جب ایک شخص یا ادارہ فی الواقع روپیہ قرض لے کر کثیر مالی منفعت حاصل کرتا ہے تو اس سے ایک معمولی رقم سود کا مطالبہ کیوں نہ قرینِ حق و انصاف سمجھا جائے۔ چنانچہ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ:

ایک حاجتمند سے جس کو ضروریاتِ زندگی کے لیے قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے سود لینا شقاوتِ قلبی ہے اور اس کی مناہی سختی سے ہونی چاہیئے۔ لیکن تجارتی سود پر یہ الزام عائد

نہیں ہوتا"۔

لہٰذا سب ایسی احادیث اور روایات کا جو تجارتی سود کو ربوا کے تحت لائیں سختی سے تجزیہ ہونا چاہیئے اور فقہ کے اس متفقہ فیصلہ پر کہ اگر منفعت کی شرط سے کوئی قرض دیا جائے تو اس کا منافع ربوا کہلاتے گا نظرثانی ہونی چاہیئے"۔ (مقتبساً از مقالہ یعقوب شاہ صاحب)

یہ تجزیہ بظاہر جس قدر جاذب نظر معلوم ہوتا ہے اسی قدر بے مصرف ہے۔ اول تو حرمت ربوا کے احکام خدا اور رسولؐ سے ایسی صورتوں کے مستثنےٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ قرض کا کسی منفعت کی شرط پر دینا سرے سے اسلامی قرض کے مزاج کے منافی ہے اور عملاً باطل ولغو ہے۔

تیسرے یہ کہ قرض دینے والا کبھی اس شرط پر قرض نہیں دیتا کہ اگر نفع کماؤ تو سود دینا ورنہ نہ دینا۔ اسی سے یہ ثابت ہے کہ قرض دینے والے کو مستقرض کے نفع ونقصان سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اگر یہ شرط سودی قرضوں میں ہو سکتی تو جواز سود کی معقول صورتیں اصول مضاربت کی روشنی میں پیدا ہو سکتی تھیں۔

چوتھے یہ کہ محض تجارت کے ذریعہ مالی منفعت کی صورت میں سود کا جواز اور کسی دوسرے ذریعہ سے مالی منفعت کی صورت میں سود کی تحریم خلاف عقل اور بے سبب ہے۔ چنانچہ مثلاً اگر ایک شخص قرض لے کر کسی ایسی جگہ شادی کرنا چاہتا ہے جہاں سے اسے کثیر مال ملنے کی توقع ہے تو کیوں نہ اس صورت میں بھی "سود" حلال ہو۔ یا ایک شخص قرض لے کر جوا کھیلتا ہے اور منافع حاصل کرتا ہے تو وہاں بھی کیوں نہ "سود" روا ہو۔

پانچویں یہ کہ محض مالی منفعت سود کے جواز کی وجہ کیوں ہو۔ جب کہ بہت سی ایسی صورتیں ہیں جہاں مالی منفعت سے بدرجہا زیادہ نفع ہوتا ہے یا کم از کم یہ کہ مالی منفعت کے حاصل کرنے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ مثلاً حصول علوم وہنر، حصول صحت وتوانائی۔ توسیع زراعت۔ اجرائے صنعت وحرفت وغیرہ کے لیے قرض لینا۔

چھٹے یہ کہ غیر ضروری مصارف مثلاً تعمیر مساجد۔ سفر زیارات یا ناچ رنگ کی محفلوں کے لیے جو قرض لیا جائے اسے سود سے مستثنےٰ کیوں کیا جائے جبکہ ان میں سے کسی شکل میں شقاوت قلبی کا شائبہ بھی نہیں اور نہ یہ احتیاجی یا صرفی قرضے کہے جا سکتے ہیں۔

ربوٰا کے معنی

ربا کے معنی اضافے، زیادتی یا بڑھوتری کے ہیں اور اصطلاح شرع میں لین دین کے ایسے معاملہ کو کہتے ہیں جس کی رو سے ایک فریق کو دوسرے سے زیادہ حاصل ہو۔ مختصراً ایسے معاملہ کو "معاملہ بالفضل" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لینے کی شرط پر معاملہ کرنا ——— اردو زبان میں اس کو "سودی معاملہ" کہتے ہیں اور جو زیادتی ہوا سے سود کہتے ہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے:

یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات ۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقوں میں بڑھوتری بخشتا ہے

اس آیت میں لفظ "الربا" حقیقت شرعی ہے اور "یربی" میں لفظ "ربا" حقیقت لغوی ہے۔ اور زیادتی کا مفہوم دونوں میں مشترک ہے۔ امام رازی صدقہ اور ربا میں باہم تضاد بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"صدقہ میں انسان خدا کے حکم سے اپنے مال میں کچھ کمی کرتا ہے اور ربا میں خدا کے حکم کے خلاف اپنے مال میں کچھ زیادتی کرتا ہے۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربا" کے معنی اس طرح بیان فرمائے ہیں:

الفضل ربا — زیادتی ربا ہے۔

الرماء ھو الربا — بڑھوتری جو ہے وہی ربا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے فرمایا:

من زاد وازداد فقد اربیٰ ۔ یعنی اگر کسی فریق معاملہ نے اضافہ کیا یا زیادہ طلب کیا تو بلاشبہ وہ سود ہے۔

ایک روایت میں "ازداد" کی بجائے "استزداد" ہے یعنی جس نے زیادت طلبی کی وہ ربا ہے:

لا تشفعوا بعضا علی بعض ۔ یعنی لین دین میں ایک کا حصہ دوسرے سے زیادہ نہ ہونے دو

کلام عرب میں یہ لفظ ہر جگہ "زیادتی" کے مفہوم میں آیا ہے (ملاحظہ ہوں کتب لغات) اب سمجھنا چاہیئے کہ زیادتی کی کیا صورت ہے؟

ظاہر ہے کہ کم یا زیادہ ہونا ایک اضافی امر ہے اور کسی چیز کو "زیادہ" نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کے مقابلہ میں وہی چیز "کم" موجود نہ ہو۔ لہٰذا اقداری طور پر "ربا" ہمیشہ اس وقت متصور ہوگا جب کہ ایک ہی چیز کی دو مساوی مقداروں میں سے ایک مقدار میں کچھ اور اضافہ کیا جائے۔ یہی اضافہ ربا ہے۔ لیکن اگر شیٔ

مختلف ہوں تو ان کی مختلف مقادیر میں کمی یا زیادتی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک تولہ سونا دس من کوئلے کے برابر کہا جا سکتا ہے لیکن دس من کوئلہ کسی صورت میں دس من سے سیر بھر کم یا زیادہ کوئلے کے برابر نہیں کہا جا سکتا۔ پس جب کبھی دو مختلف النوع اشیاء کا باہمی تبادلہ کیا جائے تو خواہ ان کی مقداروں میں کتنا ہی تفاوت ہو "زیادتی" کو دخل نہیں ہوتا۔ اور اس قسم کا معاملہ "عدل" پر مبنی ہوگا۔ البتہ متحد النوع اشیاء کے تبادلہ میں عدل کا تقاضا یہی ہے کہ فریقین کا حصہ برابر سرابر ہو اس کے خلاف ہوا تو ایک فریق پر ظلم ہوگا۔ گویا "اضافہ" صرف متحد النوع اشیاء کے ساتھ ہی معاملہ میں ہو سکتا ہے اور مختلف النوع اشیاء کے معاملہ میں "اضافہ" کا وجود نہیں ہے۔ معاملات میں عدل و ظلم کے اسی موقف کی نشاندہی قرآن حکیم کی اس آیت میں فرمائی گئی ہے:

احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ — اللہ تعالےٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے۔

مدعا یہ ہے کہ بیع وہ معاملہ ہے جس میں زیادتی نہ ہو اور "ربا" وہ معاملہ ہے جس میں زیادتی ہو۔ چونکہ مختلف چیزوں کے باہمی تبادلہ یا خرید و فروخت میں زیادتی کا تصور ہی نہیں لہذا اس قسم کا تبادلہ حلال ہے۔ اور وہی بیع ہے۔ ایک روپیہ میں تین سیر آٹا خرید یئے۔ ٹوپی کے بدلے میں قلم کا سودا کیجئے یا برتن کے عوض میز کرسی لیجئے سب روا اور حلال ہے۔ نقد بھی اور ادھار بھی۔ لیکن ایک روپیہ دے کر سوا روپیہ لینا یا تین سیر آٹے کے عوض سوا تین سیر آٹا لینا بہر حال حرام ہے اور "ربا" ہے نقد بھی اور ادھار بھی۔

بیع اور ربا کے اس فرق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار اور مختلف طریقوں سے سمجھا دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل (بخاری) — یعنی سونے کا سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گندم کا گندم سے اور جو کا جو سے اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے برابر سرابر ہی معاملہ کیا جا سکتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے فرمایا:

الذھب بالذھب ربا الا ھاء وھاء۔ — یعنی سونے کا تبادلہ سونے سے سود ہوگا اگر اتنے کا اتنا ہی نہ ہو۔

دوسری حدیث کے الفاظ ہیں "الا وزنا بوزن" یعنی سود ہوگا اگر دونوں ہم وزن نہ ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے "لا زیادۃ بینھما" یعنی دونوں میں سے کسی ایک کی مقدار دوسرے سے زیادہ نہ ہو۔

پھر ایک اور حدیث میں تہدید فرمائی کہ "جسے اللہ اور آخرت پر ایمان ہے اسے ممنوع اشیاء کا برابر سرابر کے بغیر ہرگز معاملہ نہ کرنا چاہیئے۔"

اس مقام پر ایک اور امر تشریح طلب تھا کہ متحد النوع یا متحد الجنس اشیاء سے کیا مراد ہے۔ اس کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بھی بیان فرما دیا ہے:

ما وزن ولا بمثل اذا کان نوعا واحدا او ما کیل مثل ذالک فاذا اختلف النوعان فلا باس به (کنز العمال)

یعنی ہر وہ شے جو تول کر بکتی ہے اگر ایک ہی نوع کی ہو تو برابر سرابر ہی معاملہ ہونا چاہیئے اسی طرح ہر وہ شے بھی جو پیمانے سے بکتی ہے۔ البتہ اگر موزوں یا مکیل اشیاء مختلف نوع کی ہوں تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں اگرکم وبیش ہوں۔

اس کی مزید تفصیل کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مثالیں بھی بیان فرمائی ہیں:

بیعوا الذهب بالفضة کیف شئتم۔

یعنی سونے کی خرید و فروخت چاندی سے جس طرح چاہو کر سکتے ہو۔ (برابری ضروری نہیں)

ایک اور حدیث میں ہے:

لا باس بالبر والشعیر اثنین بواحد۔

یعنی گندم کا تبادلہ جو کے ساتھ مقصود ہو تو ایک کے عوض دو لینے میں کوئی حرج نہیں۔

رہا یہ سوال کہ غیر مکیل اور غیر موزون اشیاء اگر متحد النوع بھی ہوں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ احکام لاگو نہیں فرمائے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ اس کا سبب نہایت ہی واضح ہے کہ ایسی تمام اشیاء جو وزن یا پیمانے سے نہیں خرید و فروخت ہوتیں ان میں منفرداً باہمی اس قدر تفاوت ہوتا ہے کہ وہ گویا دو مختلف النوع اشیاء بن جاتی ہیں۔ مثلاً ایک گھوڑا یا اونٹ دوسرے گھوڑے یا اونٹ سے ایک میز یا کرسی دوسری میز یا کرسی سے ایک کپڑا یا لباس دوسرے کپڑے یا لباس سے ممنوع ہونے کے باوجود اس درجہ مختلف ہے کہ گویا وہ ممنوع اشیاء ہیں ہی نہیں۔ یہ کیفیت کسی مکیل یا موزون شے میں نہیں ہے اور یہ نہایت واضح امر ہے۔

خدا و رسولؐ کی ان تصریحات سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

(۱) ربوا کے معنی "زیادتی" کے ہیں

(۲) معاملہ بیع میں "زیادتی" نہیں ہے۔

(۳) معاملہ ربا میں "زیادتی" ہوتی ہے
(۴) مختلف النوع اشیاء کے تبادلہ یا خرید و فروخت میں "زیادتی" کا تصور ہی نہیں ہے۔
(۵) زیادتی صرف متحد النوع اشیاء کے تبادلہ میں متصور ہو سکتی ہے۔
(۶) متحد النوع اشیاء وہی ہیں جو مکیل اور موزون ہوں۔
(۷) غیر مکیل یا غیر موزون اشیاء کو متحد النوع ہونے پر بھی حکماً مختلف النوع سمجھا جائے گا۔

ربا کی اس حقیقت کے پیش نظر قرض میں "ربا" کا تصور کیجیے۔ قرض نام ہی اس معاملہ کا ہے صح القرض فی مثلی۔ قرض صرف ہم نوع اشیاء میں ہوتا ہے یعنی غیر مثلی (مختلف النوع اشیاء) میں قرض ہوتا ہی نہیں۔ اب جب کہ ہم نوع اشیاء کا معاملہ ہے تو اس میں ایک فریق کے لیے زیادہ کا مطالبہ خلاف عدل اور ناجائز ہے۔

ربٰو اور ربح میں فرق

"ربوا" وہ متعین اضافہ ہے جو کسی ایک معاملہ کی شرط ہو اور کسی ایک فریق معاملہ کا حق قرار دیا جائے۔ اسے "سود" کہتے ہیں اور "ربح" وہ غیر متعین اضافہ ہے جو نہ کسی ایک معاملہ کی شرط ہو اور نہ کسی ایک فریق معاملہ کا حق قرار دیا جائے۔ اسے منافع کہتے ہیں۔

(۲) "ربا" ہمیشہ متحد النوع اشیاء کے تبادلہ میں متصور ہے اور "ربح" ہمیشہ مختلف الانواع اشیاء کے تبادلوں میں متصور ہے۔

(۳) "ربا" ایک معین اور متیقن اضافہ ہے اور "ربح" ایک غیر معین اور غیر متیقن اضافہ ہے۔

(۴) "ربا" کی بنیاد "زیادت طلبی" پر ہے جو ظلم ہے اور "ربح" کی بنیاد برابری پر ہے جو "عدل" ہے (ملاحظہ ہو جواب سوال نمبر ۲) یہاں پر توضیح مدعا کے لیے ایک مثال کافی ہوگی۔

دس روپے دے کر گیارہ روپے لینے میں جو اضافہ "عیاں" ہے وہ ربا ہے۔ اور دس روپے دے کر بیس سیر گندم لینے میں جو اضافہ "متوقع" ہے وہ ربح ہے۔

پہلی شکل میں "اضافہ" معاملہ کی شرط اور اس کا جزو ہے کہ اگر فریق ثانی ایک روپیہ زیادہ دینے پر تیار نہ ہو تو وہ معاملہ ہی نہ ہوگا۔ لیکن دوسری شکل میں کوئی اضافہ معاملہ کی شرط یا جزو نہیں ہے۔ کہ اگر بیس سیر گندم گیارہ روپے میں نہ بکے تو سودا ہی نہ ہوگا۔

پہلی شکل میں ایک روپیہ کی منفعت ایک فریق کے لیے لازمی ہے اور اسے گھاٹے کا کوئی خطرہ نہیں یہی ربا ہے۔ لیکن دوسری شکل میں جو منفعت متوقع ہے وہ کسی فریق کے لیے متیقن نہیں ہے اور اسی لیے ہر ایک

کو گھاٹے کا خطرہ ہے۔ یہی "ربح" ہے۔

ایک ہی معاملہ میں ایک فریق کے مفاد کا تحفظ اور دوسرے فریق کے مفاد کا مشتبہ ہونا یقیناً ایک فریق کے حق میں بڑھوتری ہے اور فریق مقابل پر ظلم ہے اور یہی ربا کی بنیاد ہے۔ اس کے برعکس ایک ہی معاملہ میں دونوں فریقوں کے لیے نفع و نقصان کا یکساں امکان دونوں میں "عدل" ہے اور کسی فریق پر ظلم نہیں اور یہی ربح کی بنیاد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "ربوا" چونکہ "یک طرفہ فائدہ" کا نام ہے اور بیع میں فریقین معاملہ میں سے ہر دو کو فائدہ پہنچتا ہے اس لیے ربوا کے مقابلہ کا لفظ "ربح" قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ اس کی بجائے "منافع" کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا۔ قرآن حکیم میں بھی لفظ "ربح" (بصورت اسم) غالباً کہیں نہیں آیا۔ البتہ "ربوا" کے مقابلہ میں لفظ "بیع" (جس کی غرض مرابحہ فریقین ہے) جو آیا ہے اس سے اس تضاد کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ ایک لفظی بحث ہے۔

ربوا اور بنک کا سود

"ربوا" میں قرض دینے والا شرائط مقرر کرتا ہے اور "بنک انٹرسٹ" میں قرض لینے والا کرتا ہے۔ اور اس سوال کا منشا یہ ہے کہ:

سود کا مدار اس اصول پر نہ ہونا چاہیئے کہ سودی معاملات میں قرض دینے والا مستقرض کے فائدے یا نقصان میں شریک نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ سود کی شرط کس نے مقرر کی؟ اگر قرض دینے والا "سود" کی تعیین کرتا ہے تو بلاشبہ وہ سود حرام ہے۔ لیکن اگر قرض لینے والا (کوئی فرد یا ادارہ) خود سود کی تعیین کر دے تو وہ "سود" نہیں رہتا۔ اور "بنک انٹرسٹ" کی چونکہ یہی صورت ہے اس لیے یہ "ربا" کے تحت نہیں آتا (بموجب تفہیم قرطاس ابیض)۔

مطلب یہ ہے کہ "جواز سود" کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ قرض لینے والا ساہوکار سے پہلے ہی یہ کہہ دے کہ مثلاً آپ مجھے ہزار روپیہ دے دیں میں آپ کو دس روپیہ فی صدی سالانہ سود ادا کروں گا تو یہ سود اس کے لیے شرعاً حلال ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے قرض مانگا اور ساہوکار نے مثلاً صرف پانچ روپے سینکڑہ ہی سود کا مطالبہ کر دیا تو اب یہ "سود" حرام ہو جائے گا۔

درحقیقت یہ نہایت مضحکہ خیز نظریہ ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نہج پر سوچنے والوں کے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ سود کا

تعین اگر قرض دینے والے کی طرف سے ہوگا تو وہ مستقرض کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا لیکن اگر طالب قرض خود سود کا تعین کرے تو اس سے سمجھا جائے گا کہ در اصل وہ محتاج نہیں ہے بلکہ محض منفعت اندوزی کے لیے قرض لے رہا ہے اور سود اس لیے دیتا ہے کہ قرض دینے والے کے مال میں اضافہ ہو اور یا یہ کہ اسے قرض دینے کی ترغیب ہو۔ لیکن یہ تصور بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اول تو کسی قرض کو احتیاج سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ حتی کہ حکومت کے قرضے بھی بسخت حاجتمندانہ قرضے ہوتے ہیں۔ تمام ترقیاتی منصوبے۔ اقتصادی استحکام۔ سرحدی تحفظات۔ ملکی معیشت کی اصلاح دفاعی انتظامات وغیرہ جتنے بھی قرض کے محرکات ہیں ان سب کے پس منظر میں ایک شدید احتیاج کا احساس کارفرما ہوتا ہے۔ اور یہ بھی میرا ذاتی خیال نہیں ہے بلکہ حدیث معراج میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبرئیل نے قرض کو صدقہ سے زیادہ موجب اجر قرار دینے کا یہ سبب بتایا کہ کہ صدقہ غیر حاجتمند کے پاس بھی جا سکتا ہے اور قرض وہی مانگتا ہے جو حاجتمند ہوتا ہے (ابن ماجہ بروایت انس)

پھر بھی اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی قرض صرف اس لیے لیا جا سکتا ہے کہ طرفین کی دولت میں اضافہ ہو تب بھی یہ اصول کہ قرض لینے والے فرد یا ادارے کے محض شرح سود کا اعلان کر دینے سے (جیسا کہ بنک کرتے ہیں) سود حلال اور مال طیب بن جائے گا قانون شریعت کا مسخر ہے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "قرض خواہ" اشخاص سود کی پیش کش لیے ہوئے ارباب دول کے دروازے پر پہنچیں گے اور اپنی ضروریات وحاجات کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ سود کی پیش کش کرتے ہوئے سودی روپیہ قرض لیں گے۔ اور ادھر قرض دینے والے مالدار اس سود کو مال طیب اور شیر مادر سمجھ کر ہضم کرتے رہیں گے۔ اور اس طرح حصول منفعت اور ازدیاد مال کا محض بہانہ حاجت مندی کے احساس کو پس منظر کے دھندلکوں میں پھینک دے گا۔

شاید یہی مصلحت تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے کے ساتھ سود دینے کی مذمت بھی یکساں شد و مد کے ساتھ بیان فرمائی ہے اور اللہ تعالے نے ازدیاد مال کی غرض سے سود دینے کو ناپسند فرمایا ہے:

وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولٰئک

اور وہ سود جو تم دیتے ہو بدیں غرض کہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو تو (اگرچہ تمہارے نزدیک اضافہ ہے لیکن) اللہ کے ہاں وہ نہیں بڑھتا البتہ وہ جو پاک دل سے

هم المضعفون -
اللہ کی خوشنودی کے لیے دنہ کہ ذاتی منفعت کے لیے،
تم دیتے ہو تو وہی انہیں دگنا ہو کر جاتا ہے۔

مفسرین نے بتایا ہے کہ اس سے مراد صدقہ ہے اور یا قرض ہے کہ وہ بھی صدقہ ہی کی ایک قسم ہے۔ بہرصورت اس آیت میں "سود لینے" کی نہیں بلکہ "سود دینے" کی مذمت ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس سود کا ذکر ہے جو کسی مجبوری سے نہیں بلکہ قارض کے مال میں اضافہ کے لیے دیا جائے ـــ اس تصریح قرآنی کے بعد بھی کیا یہ نظریہ اپنی جگہ پر قائم رہ سکتا ہے کہ اگر قرض دینے والا خود سود مقرر کرے تو وہ حلال ہو جائے گا۔

واضح ہو کہ یہ آیت نفع اور قرضوں کے سود پر بالعموم اور پراویڈنٹ فنڈ کے سود پر بالخصوص لفظ بلفظ منطبق ہوتی ہے کیونکہ اس آیت میں سود دینے کی غرض محض یہ بتائی گئی ہے کہ سود لینے والے کے مال میں اضافہ کیا جائے۔ یہ غرض فنڈ کے سود سے قطعاً مطابقت رکھتی ہے لیکن اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ البتہ وہ رقم جو حکومت ملازمین کی اصل رقم کا المضاعف اپنی طرف سے تفضلاً عطا کرتی ہے وہی اللہ کے نزدیک پسندیدہ طریق کار ہے۔ مفسرین نے اس آیت کو پراویڈنٹ فنڈ پر منطبق نہیں فرمایا کیونکہ اس طریق کار کا تصور ان کے ذہن میں نہ تھا البتہ تحفہ تحائف اور ہدایا کے لین دین سے واقف تھے اس لیے بعض اصحاب نے اس آیت کو اسی پر منطبق کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس نیت سے 'ہدیہ' یا 'تحفہ' دینا کہ اس سے زیادہ یا بہتر ہدیہ ملے گا۔ اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ توجیہ یہاں پر منطبق نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ توجیہ بھی ہمارے لیے مفید مدعا ہے۔

کمرشل انٹرسٹ

مصنفہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

کیا تجارتی سود" واقعی وہی ربٰو ہے جس کی قرآن نے ممانعت کی ہے؟ اس مضمون پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اور اس کے تمام ضروری پہلوؤں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ صفحات ۱۲۴۔ قیمت ۸/۱ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور